ISSN:2708-5724, E-ISSN:2708-5732

ترقی پسند کہانی کار: حمید اختر

Progressive Short Story Writer – Hameed Akhtar

[1] شکیل حسین سید   [2] ڈاکٹر حماد رسول

Abstract:

Some people know Hamid Akhtar as a journalist, but his main identity is a writer and as a writer his main status is a storyteller. The subject of fiction is the common man and his problems. Fiction reflects progressive ideas. Written in search of a better life in an exploitative society, these stories do not propagate a better life but fulfill their artistic requirements. Hameed Akhtar struggled all his life, and this struggle was for the unfortunate people who were deceived step by step. As a communist, these stories promote social justice.

Keywords: Short Stories Writer, Progressive, Exploitative Society, Communist, Social Justice.

حمید اختر کو بعض لوگ صحافی جانتے ہیں مگر ان کی بنیادی پہچان ایک ادیب کی ہےا ور ایک ادیب کے طور پر بنیادی حیثیت ایک کہانی کار کی ہے۔ افسانوں کا موضوع عام آدمی اور اس کے مسائل ہیں۔ افسانے ترقی پسند خیالات کے عکاس ہیں۔ استحصالی معاشرے میں بہتر زندگی کی تلاش میں لکھی جانے والی یہ کہانیاں بہتر زندگی کا پراپیگنڈہ نہیں بلکہ اپنے فنی تقاضوں کو پورا کرتی ہیں۔ حمید اختر نے ساری زندگی جدوجہد کی اور یہ جدوجہد ان کی ذات سے ہٹ کر ان بدقسمت لوگوں کے لیے جنہیں قدم قدم پر دھوکہ دیا گیا۔ ایک کمیونسٹ ہونے کے ناطے یہ کہانیاں سماجی انصاف کا پرچار کرتی ہیں۔

کلیدی الفاظ: کہانی کار، ترقی پسند، استحصالی معاشرہ، کمیونسٹ، سماجی انصاف۔

حمید اختر کو بعض لوگ صحافی جانتے ہیں مگر ان کی بنیادی پہچان ایک ادیب کی ہے اور ایک ادیب کے طور پر بنیادی حیثیت ایک کہانی کار کی ہے۔ حمید اختر نے اپنے ادبی کیریئر کا آغاز افسانہ نگاری سے کیا۔ یہ آغاز کافی سست رو تھا اور ۱۹۴۲-۴۷ء کے دوران وہ چار پانچ کہانیاں ہی لکھ پائے لیکن وہ اس بات کا تعین کر چکے تھے کہ ان کے مستقبل کا میدان افسانہ ہی ہو گا۔ ۱۹۴۴-۴۵ء میں جب وہ اور ساحر لاہور میں تھے اور ساحر ترقی پسند ادبی مجلے ادبِ لطیف کی ادارت کر رہے تھے حمید اختر کا ایک افسانہ شہزادے ادبِ لطیف میں شائع ہوا۔ ان دنوں لاہور دہلی اور ممبئی ترقی پسند تحریک کے بڑے مراکز تھے۔ دوسری عالمی جنگ محوری قوتوں کے خلاف اپنے

[۱] استاد ، شعبۂ اردو، گورنمنٹ ملت ایسوسی ایٹ کالج، ملتان
[۲] استاد، شعبۂ اردو، بہاءُ الدین زکریا یونی ورسٹی، ملتان

انجام کی طرف بڑھ رہی تھی۔ کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا حق خودارادیت کی بنیاد پر مسلمانوں کے ایک علیحدہ وطن کی ۱۹۴۲ء سے حمایت کر رہی تھی۔

ترقی پسند ادیب اور شاعر مسلم لیگ کے کافی قریب آ چکے تھے۔ پارٹی کا ہفت روزہ اخبار قومی جنگ جو دوسری عالمی جنگ کے خاتمے کے بعد نیا زمانہ کے نام سے شائع ہوتا رہا، سید سجاد ظہیر کی ادارت میں ممبئی سے شائع ہو رہا تھا۔ اخبار میں سجاد ظہیر، سبطِ حسن، ڈاکٹر اشرف، دوسری عالمی جنگ اور تحریکِ پاکستان کے حوالے سے باقاعدگی سے لکھ رہے تھے۔

اس سیاسی اور نظریاتی پس منظر میں لاہور بھی ترقی پسند شعر وادب کی سرگرمیوں کا مرکز بن چکا تھا۔ ادب لطیف سے ساحر کی وابستگی کے سبب حمید اختر بھی ان سرگرمیوں میں پیش پیش تھے۔ انہیں لاہور پسند آیا تھا، جوان کا مستقبل کا شہر بننے والا تھا۔ اس اثناء میں وہ راجندر سنگھ بیدی کے قائم کردہ اشاعت گھر سنگم پبلشرز کے لیے چیکوسلواکیہ کے ادیب اگنات ہرمین کے ناولٹ Childless کا ترجمہ بے برگ و گیاہ کے نام سے کر کے شائع کروا چکے تھے۔

۱۹۴۵ء کے اوائل میں ساحر لدھیانوی کی تجویز پر حمید اختر نے ۱۹۴۴ء میں شائع ہونے والے نمائندہ افسانوں کا ایک انتخاب ''دھرتی کے آنسو'' کے نام سے مرتب کیا جو جین بک ڈپو انارکلی لاہور سے شائع ہوا۔ اس مجموعے میں دیوندر سیتارتھی، احمد ندیم قاسمی، رامانند ساگر، شفیق الرحمٰن، ریاض روفی، مہندر ناتھ، مدھوسودن، کرشن چندر اور شیل ساگر جین کے علاوہ خود حمید اختر کے افسانے شامل تھے۔ احمد سلیم کے مطابق ''کہانی'' حمید اختر کی پہلی محبت ہے:۔

> ''جی ہاں کہانی حمید اختر کی پہلی محبت ہے، جو ایک بہتر دنیا کی تلاش میں ہوئی اور یہ آخری محبت بھی ہے۔''[۱]

غم روزگار کے مسائل کے باعث کہانیاں بہت کم لکھیں اس کے باوجود ان کے سینے میں ایک ادیب کا دل پوری توانائی سے دھڑکتا رہا۔ افسانے کم لکھنے کی وجوہات کھل کر بیان کیں:۔

''اب تھوڑی سی میرے کم لکھنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ میں نصابی کہانی نہیں لکھ سکتا تھا نہ میں نے اپنے آپ کو کبھی کاریگر افسانہ نگار سمجھا۔ کوئی قصہ یا واقعہ سن کر میں کہانی کا تانا بانا نہیں بن سکتا جب تک میں کسی واردات کا حصہ نہ بنوں میری بیشتر کہانیاں قیام پاکستان کے بعد کے ابتدائی دس پندرہ برس کی سیاسی اور سماجی تاریخ کا حصہ ہیں۔ میں نے ادب کی ترقی پسند تحریک سے متعلق ہونے کی وجہ سے رجائیت کا دامن کبھی ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔''[۲]

افسانوی مجموعہ ''لامکاں'' کو پاکستان بکس اینڈ لٹریری ساؤنڈز نے ۱۹۹۱ء میں لاہور سے شائع کیا جس میں کل اٹھارہ افسانے شامل ہیں۔ چودہ افسانوں کے آخر میں ان کا سنِ اشاعت درج ہے جو ۱۹۴۹ء سے ۱۹۹۱ء کے عرصہ کی تخلیق ہیں۔ چار افسانوں کا سن اشاعت نہیں کتاب پر دیباچہ ''عندلیبِ گلشنِ ناآفریدہ'' کے عنوان سے اخلاق احمد دہلوی نے لکھا ہے۔

''لامکاں'' میں درج ذیل افسانے شامل ہیں۔

کرن پھوٹتی ہے (۱۹۴۹ء)، ایک جہاں یہ بھی ہے (س ن)، آخری رات (۱۹۵۲ء)، کیمیا کا نسخہ (۱۹۵۵ء)، حاتم شہر آرزو (س ن)، یہ لوگ (۱۹۵۵ء)، نئے پرانے (۱۹۶۱ء)، سلور جوبلی (۱۹۷۴ء)، صبح و شام (۱۹۵۵ء)، آؤ بچو (۱۹۸۶ء)، لامکاں (۱۹۸۴ء)، مفادِ عامہ (۱۹۵۲ء)، بہادر (س ن)، پیسے کی کہانی (۱۹۵۰ء)، اندیشے (۱۹۵۳ء)، ایک ہی بات (۱۹۵۳ء)، علاج (س ن)، مرزا دبیر الحسن کیسے مرے (۱۹۹۱ء)، غیر مطبوعہ افسانے شہزادے ماہنامہ ادب لطیف، لاہور ۱۹۹۴ء میں اپنے فرماں بردار بیٹے کو عاق کرتا ہوں، ماہنامہ تخلیق، لاہور ۱۹۹۰ء، پھٹی پُرانی ٹیلی فون ڈائری، معاصر لاہور ۱۹۹۶ء، آؤ بیوی باتیں کریں، ماہنامہ تخلیق لاہور، اپریل ۱۹۹۷ء۔

افسانوں کا موضوع عام آدمی اور اس کے مسائل ہیں۔ افسانے ترقی پسند خیالات کے عکاس ہیں۔ استحصال، نابرابری کی بدولت خرابیوں سے پیدا ہونے والی بے بسی کی کیفیات کے علاوہ پاکستان بننے سے پہلے دو

ISSN:2708-5724, E-ISSN:2708-5732

دہائیوں کی سیاسی و سماجی صورتحال اور پاکستان بننے کے فوراً بعد ہجرت کر کے پاکستان آنے والوں کی نفسیات پیچھے چھوڑی جانے والی املاک اور شناخت، خدشات، محرومیوں کے مرقعے پیش کیے ہیں۔

''کرن پھوٹتی ہے'' طویل افسانہ ہے جس کا موضوع پنجاب کا بٹوارہ ہے۔ شیرا ایک ایسا نوجوان ہے جو ہجرت کر کے پاکستان آیا ہے پاکستان کے لوگوں نے اسے یہاں کا باشندہ تسلیم نہیں کیا وہ ایک بوڑھے جلال دین کے ساتھ سفر کر رہا ہے۔ دونوں محرومیوں کے مارے ہوتے ہیں۔ دونوں پرانی یادیں تازہ کرتے ہوئے خوشیوں کی تلاش میں نکلے مگر دونوں پاکستان کے لوگوں سے نفرت اور بدگمانی کا اظہار کرتے ہیں۔ آگے جا کر شیرے کی ملاقات ایک اور بوڑھے سے ہوتی ہے اس کا عزم آہنی ہے اس کے نظریات سن کر شیرے کی مایوسی اور خود ترسی کی کیفیت ختم ہو جاتی ہے:۔

> ''جیسے اس کی کھوئی ہوئی دنیا اسے واپس مل رہی ہے وہ بھی بوڑھے کے ساتھ کچھ دیر آرام کرنے کے خیال سے دراز ہو گیا اور جب اس نے اپنے ہاتھ بوڑھے کی سوکھی چھاتی پر رکھا تو یکا یک اسے محسوس ہوا جیسے وہ طویل سفر کر کے اپنے اصلی گھر واپس آ گیا ہو اور اپنے باپ سے لپٹ کر مچل رہا ہو۔'' [۳]

''ایک جہاں یہ بھی ہے'' کا موضوع بھی تقسیم ہند ہے جو حمید اختر کی دردمندی کا اظہار ہے۔ جدید معاشرے نے روایات اور تہذیبی اقدار کو بدل دیا ہے۔ اس تبدیلی کا نوجوانوں کے جذبات اور نفسیات پر گہرا اثر ہوا ہے۔ ماتم شہر آرزو کا موضوع بدلتی ہوئی اقدار ہیں جنھوں نے نہ صرف شہروں کو بلکہ دیہات کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے۔

''ماتم شہر آرزو'' کا کردار صمد خان جو سارا یورپ گھوم چکا ہے۔ اس کی تلاش ایسی عورت ہے جس میں معصومیت، سادگی اور حسن جو مشرقی عورت کا خاصہ ہے وہ سرسوں دھان کی بالیوں اور شیشم کے پتوں اور کیکر کے پھولوں کی ملی جلی خوشبو کو ایک نسوانی پیکر میں دیکھنا چاہتا ہے۔ پاکستان کے دیہات میں اسے ایک ایسی

عورت مل جاتی ہے جس میں وہ تمام خوبیاں موجود ہیں جو اسے یورپ سے پاکستان لے آتی ہے۔ لیکن افسانے کے آخر میں اس عورت کی حقیقت کسی اور روپ میں سامنے آتی ہے:۔

> ''کیا تم میرے ساتھ رہنے کے لیے تیار ہو؟
> عورت نے اثبات میں سر ہلایا، صمد کے ذہن کی تاریکی چھٹ گئی۔ ایک دم گویا ان کے سامنے ساری دنیا روشن ہو گئی۔ انہوں نے پھر اپنا سوال دہرایا۔ تم میرے ساتھ رہو گی؟ کتنی دیر کے لیے؟ یہ کیوں پوچھتی ہو؟ اس لیے کہ کم وقت کم پیسے ہوں گے، رات بھر رکھنا ہے تو زیادہ پیسے ہوں گے۔''[۴]

''لامکاں'' اور ''آخری رات'' افسانے مصنف کے ذاتی تجربات اور مشاہدات پر مبنی ہیں۔ ''لامکاں'' اپنے گھر کی حسرت کا بیان اور کرائے کے گھروں کی اذیت اور ذاتی گھر نہ ہونا زندگی کا بڑا دکھ ہے۔ افسانے ''آخری رات'' کال کوٹھڑی کی بازیافت ہے جس میں پھانسی کی قیدی کی آخری رات کا حال ہے:۔

> ''لگتا ہے کال کوٹھڑی لکھنے کے بعد بھی یہ کردار حمید اختر کا پیچھا کرتے رہے۔ خود بھی پھانسی چڑھتے رہے ہیں اور اپنے ساتھ حمید اختر کو بھی پھانسی کے تختے پر کھینچتے رہے ہیں۔''[۵]

''مرزا دبیر الحسن کیسے مرے'' دیانت دار اور باضمیر شخص کا المیہ ہے۔ بدلتے ہوئے سماج میں استحصال کا شکار طبقہ، بے بسی کی زندگی بسر کر رہا ہے۔ سرمائے کی غلط تقسیم نے پرانی اقدار کو بدل دیا ہے۔ نئے ماحول اور بدلتے ہوئے سماج میں وہ اعلیٰ اقدار کے ساتھ زندہ نہیں رہ سکتا جب تک وہ تمام اخلاقی اصولوں اور ضمیر کا گلا نہ گھونٹ دے:۔

> ''یہ ملک اب طالع آزماؤں کے ہاتھ میں ہے جو جھوٹ فریب اور نقلی وعدوں کے ذریعے اپنے اقتدار کو طول دے رہے ہیں۔ میں انہیں ان کے بلند مرتبت سے نہیں ہٹا سکتا۔ ان سے لڑ نہیں سکتا کہ میرے جسم کے خون کا آخری قطرہ تک یہ نچوڑ چکے ہیں۔ اس لیے میں اپنی

زندگی ختم کر رہا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ حرام موت مر رہا ہوں مگر اس حلال زندگی سے کہیں زیادہ بہتر ہے جسے بسر کرنے کے لیے مجھے مجبور کیا جا رہا ہے۔''[۶]

شہزادے کی کہانی پانچ ادیب دوستوں نذیر، مصطفیٰ، ارشد، طاہر اور دھرم پرکاش کے گرد گھومتی ہے۔ جو ایک بوسیدہ کمرے میں بے سروسامانی کی حالت میں رہتے ہیں۔ دھرم پرکاش گرلز کالج میں پروفیسر کی ملازمت ملنے پر انہیں چھوڑ جاتا ہے۔ جس کا دکھ ان سب کو ہے یہ سب ایک دوسرے سے اس حد تک بے تکلف ہیں کہ بغیر بتائے ایک دوسرے کی جیب سے پیسے نکال لیتے ہیں۔ افسانے میں بے روزگاری اور غربت کے باعث نوجوانوں میں پیدا ہونے والی محرومیوں کو موضوع بنایا گیا ہے اور اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ لڑکیاں شادی بھی انہی سے کرتی ہیں جو دولت مند ہوں اور مفلسی کے ہاتھوں تنگ نوجوانوں کے حصے میں سوائے ناکام حسرتوں کے کچھ نہیں آتا۔ کیونکہ آخر میں دھرم پرکاش کی محبوبہ اس سے شادی سے یہ کہہ کر انکار کر دیتی ہے کہ اس کی مختصر تنخواہ میں وہ گزارا نہیں کر سکتی اور افسانہ نگار بڑے دکھ سے کہتا ہے:۔

''میں تو بہت زیادہ حیران ہوں کہ یہ لڑکیاں جب محبت کرتی ہیں تو آرٹسٹ، ادیب اور شاعر ڈھونڈتی ہیں اور جب شادی کا سوال پیدا ہوتا ہے تو کار اور کوٹھی کا مطالبہ کرتی ہیں۔''[۷]

''میں اپنے فرماں بردار بیٹے کو عاق کرتا ہوں'' کا موضوع بدلتی ہوئی سماجی اقدار پر بلیغ طنز ہے۔ باپ سید شمس الدین بیٹے کی تربیت اعلیٰ اخلاق، اصول و نظریات کے تحت کرتا ہے اور اسے اچھا انسان بنانے میں کامیاب ہو جاتا ہے مگر بدلتے ہوئے سماج کا معیار شرافت نہیں، اقدار و تہذیب کی بجائے دولت ہے جس کے باعث اس کے بیٹے کو بنیادی انسانی ضرورتوں سے محروم ہونا پڑتا ہے۔ آخر میں باپ وراثت میں دی گئی اچھی اقدار اعلیٰ اخلاقی اصول کے بوجھ سے عاق کر دیتا ہے:۔

''میرا بیٹا قناعت کی گدڑی میں پستا، ریفریجریٹر، ایئر کنڈیشنر، ٹی وی، وی سی آر اور مائیکرو ویو کی دنیا کو دور سے دیکھتا ہوا بے حال ہو گیا۔ وہ ایمانداری سے جو کچھ کماتا بڑھتی قیمتیں اور ضرورتیں اسے روزانہ پہلے سے کم کر دیتی۔ اب ہماری آنکھیں ملتی ہیں تو میں منہ دوسری طرف پھیر لیتا ہوں۔ اب اسے نصیحت کرنے کی تاب مجھ میں نہیں رہی۔''[۸]

افسانہ ''پھٹی پرانی ٹیلی فون ڈائری'' میں گزرتے ہوئے ماضی اور کرداروں کو یاد کیا گیا ہے۔ ماضی کے دوست اور رفاقتوں، یادوں کو ذہن سے جھٹکنا، گوشت سے ناخن جدا کرنا ہے:۔

> ''وہ تو ہمیشہ اُن کے ساتھ ان کے آس پاس رہا تھا اور جس کے نام اور فون نمبر پر خط کھینچنے کے خیال ہی سے قلم ان کے ہاتھ سے گر گیا۔ وہ جاگ رہے تھے یا سو رہے تھے، زندہ تھے یا مردہ، بے ہوشی میں تھے یا ہوش و خرد کی سرحدوں کو پار کر چکے تھے۔ انہیں کچھ پتہ ہی نہیں چلتا۔''[۹]

''آؤ بیوی باتیں کریں'' بظاہر بوڑھے میاں بیوی کے درمیان مکالمہ ہے مگر اس کے ذریعے حمید اختر ان لوگوں سے مخاطب ہیں جو عمر گزرنے پر یہ سمجھ لیتے ہیں کہ اب وہ معاشرے کا بے کار عضو ہیں اور یوں وہ دنیا سے کنارہ کشی اختیار کر لیتے ہیں اور باقی کے دن موت کے انتظار میں بسر کرتے ہیں۔ ایسے میں گفتگو کم ہو جاتی ہے اور باقی ایام موت کے انتظار میں کاٹ دیتے ہیں:۔

> ''ہم اپنے جیسے بہت سے لوگوں سے بہتر زندگی گزار رہے ہیں۔ پھر ہم چپ کیوں ہیں؟ اپنے حصے کی خوشیاں سمیٹ کر زندگی کے حسن و جمال سے آشنا اور فیض یاب ہونے کے بعد یہ خاموشی بلا جواز ہے۔ خدا کے لیے اس گراں بار خاموشی کو ختم کرو۔ آؤ ہم یہ بوجھ اتار پھینکیں اور پھر سے خواب دیکھیں۔ بہتر دنیا اور بہتر زندگی کے صرف اپنے ہی لیے نہیں، سب کے لیے جن میں ہمارے بچے اور ہماری آنے والی نسلیں شامل ہوں۔''[۱۰]

اُن کی ایک کہانی ''اندیشے'' جس میں ایک شام کی منظر کشی کی گئی ہے کی طرف اُردو افسانے کے نقاد کی توجہ مبذول نہیں ہوئی۔ ایک چپ چاپ سلگتی، درد بھری شام، افسردہ اور روتی ہوئی شام، مشرق کی طرف ستاروں کی شمعیں ٹمٹمانے لگی ہیں اور روحوں کے گھروندوں میں اندھیرا ہے اور درد اپنی غلاظت کے غلاف میں کس طرح چپ چاپ لیٹی پڑی ہے۔ بے مہر سنگدل شام قدم قدم بڑھتی ہوئی موج در موج پوری کائنات کو اپنی لپیٹ میں لے رہی ہے۔ غمگیں زخمی شام۔ جہاں کچھ نظر آتا ہے، وہاں بھی کچھ نہیں ہے کیونکہ ہر حرکت جمود

کی طرف ہے۔ اس عالم میں کہانی اپنے اختتام کو پہنچتی ہے۔ کہانی یا وہ شام یا خود زندگی۔ واہمہ حقیقت بن رہا ہے اور موت کے قدم واقعی پھیلتے جا رہے ہیں۔

آؤ بچو! نئے لب و لہجے کی کہانی ہے لیکن اس میں یادِ ماضی درد کی بجائے تفاخر کا رنگ لے لیتا ہے۔ اپنی تیسری نسل کو اپنے پرانے عہد کی کہانیاں سناتے ہوئے ایک بزرگ شخص بچوں کو تاسف کے ساتھ بتاتا ہے کہ وہ فطرت سے کتنے دور ہو گئے ہیں۔ نئی نئی مشینی آسائشوں نے انہیں زندگی کے معصوم حسن سے محروم کر دیا ہے۔ لیکن بچوں کا ردِ عمل اس شاندار ماضی کی نفی کر دیتا ہے:۔

> ''دادا جان! آپ بڑے بد قسمت تھے اور بیوقوف بھی!
>
> کیوں بیٹے؟
>
> آپ کے پاس کچھ تھا ہی نہیں۔ نہ بجلی، نہ پنکھا، نہ ریڈیو، نہ ٹیلی ویژن، نہ ائیر کنڈیشن۔ آپ کے پاس کپڑے بلکہ جوتے تک نہیں ہوتے تھے۔ آپ سفر نہیں کر سکتے تھے۔ آپ کے بچپن میں طرح طرح کی گیمز نہیں تھی۔ بس یونہی سارا دن آپ دھوپ اور گرمی میں آوارہ پھرتے رہتے تھے۔ افسوس کہ آپ کا بچپن بہت بُرا گزرا۔''[۱۱]

حمید اختر باشعور افسانہ نگار ہیں اور کہانی لکھنے کے ہنر سے آگاہ ہیں۔ اُن کی سیاسی اور سماجی جدوجہد اور اس پر پڑنے والے نفسیاتی اشتراکات کا مظہر ہیں:۔

> ''وہ اوّل و آخر کہانی کار ہیں وہ علامتوں سے کام نہیں لیتے ان کے ہاں واقعاتی تسلسل کیساتھ زندہ اور حقیقی کردار بھی ملتے ہیں۔ وہ سارے تقاضے جو ایک کہانی کو بطور کہانی کے پورے کرنے چاہئیں۔ حمید اختر کی کہانیاں پورا کرتی ہیں۔''[۱۲]

حمید اختر کی کہانیاں محض فنی تقاضے ہی نہیں بلکہ اپنے عہد کے سماجی اور سیاسی تقاضے بھی پورا کرتی ہیں ان کے ہاں ہر واقعہ دوسرے واقعہ سے اپنا منطقی تسلسل برقرار رکھتا ہے ایک ایسی لڑی جس میں سارے واقعات پرو دیئے گئے ہوں اور ہر کردار اپنا مخصوص رول ادا کرتے ہوئے اپنی موجودگی کا جواز سامنے لاتا ہے۔

استحصالی معاشرے میں بہتر زندگی کی تلاش میں لکھی جانے والی یہ کہانیاں بہتر زندگی کا پراپیگنڈہ نہیں بلکہ اپنے فنی تقاضوں کو پورا کرتی ہے۔ حمید اختر نے ساری زندگی جدوجہد کی اور یہ جدوجہد ان کی ذات سے ہٹ کر ان بدقسمت لوگوں کے لیے کی جنہیں قدم قدم پر دھوکہ دیا گیا۔ ایک کمیونسٹ ہونے کے ناطے یہ کہانیاں سماجی انصاف کا پرچار کرتی ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ احمد سلیم، حمید اختر: سوانح عمری (لاہور: بک ہوم، ۲۰۱۰ء)، ص ۲۰۲۔

۲۔ حمید اختر، لامکاں (لاہور: پاکستان بکس اینڈ لٹریری ساؤنڈز، ۱۹۹۱ء)، ص ۱۸۔

۳۔ ایضاً، ص ۴۱۔

۴۔ ایضاً، ص ۱۰۴۔

۵۔ احمد سلیم، حمید اختر: سوانح عمری، ص ۲۱۰۔

۶۔ حمید اختر، لامکاں، ص ۲۴۳۔

۷۔ حمید اختر، ''شہزادے''، مشمولہ: ادبِ لطیف (لاہور: جنوری، ۱۹۹۴ء)، ص ۱۳۷۔

۸۔ حمید اختر، ''میں اپنے فرماں بردار بیٹے کو عاق کرتا ہوں''، مشمولہ: ماہنامہ تخلیق (لاہور: ۱۹۹۴ء)، ص ۶۴۔

۹۔ حمید اختر، ''پھٹی پرانی ٹیلی فون ڈائری''، مشمولہ: معاصر (لاہور: ۱۹۹۶ء)، ص ۱۵۰۔

۱۰۔ حمید اختر، ''آؤ بیوی باتیں کریں''، مشمولہ: ماہنامہ تخلیق (لاہور ۱۹۹۷ء)، ص ۴۱۔

۱۱۔ حمید اختر، آؤ بچو (لاہور: پاکستان بکس اینڈ لٹریری ساؤنڈز، ۱۹۹۱ء)، ص ۹۸۔

۱۲۔ میرزا ادیب، کلاسیکی روایات کے خوبصورت افسانے (لاہور: روزنامہ نوائے وقت)، ۱۹۹۱ء۔